مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں اُردو بطور ذریعہ تعلیم-تحریک اور اثرات

ڈاکٹر صوفیہ خشک *

Abstract:

With the description of the role of Urdu language in the Educational progress of the Muslims of sub continent,artical also evaluates the work and contribution of different educational institutions regarding the enrichment of Urdu language and literature .

زبان کا انسان اور انسانی تہذیب کے ارتقا میں اہم کردار رہا ہے کیوں کہ یہ زبان ہی ہے جو انسان اور حیوان میں فرق کا سبب بنتی ہے اور یہی انسانی شعور کی علامت ہے۔ زبان سے ہی زندگی میں با مقصد اور با معنیٰ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ مختلف تہذیبی عوامل، قدرتی عناصر، مسلسل میل جول اور رسوم معاشرت صدیوں میں کسی زبان کے خدوخال کو اجاگر کرتے ہیں۔ اسی لیے دنیا کی ہر زبان میں لسانی عمل اور ادب کی تخلیق کے درمیان وقت کا طویل فاصلہ ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب بھی اسی عمل سے گزر کر اپنی موجودہ منزل پر پہنچے ہیں۔

مسلمان جب برصغیر میں آئے تو اس وقت ان کی زبانین عربی، فارسی، ترکی تھیں اور جب باقاعدہ طور پر ہندوستان پر ان کا اقتدار قائم ہوا تو فارسی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ مسلمانوں کا کلچر فاتح قوم کا کلچر تھا جس میں زندگی کی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹنے کی طاقت موجود تھی اور جب اس کلچر نے ہندوستان کے کلچر کو نئے انداز سکھائے اور یہاں کی بولیوں پر اثر ڈالا تو ان بولیوں میں سے ایک جو پہلے ہی سے جذب و قبول کی صلاحیت رکھتی تھی اور مختلف بولیوں کے مزاج کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھی وہ تیزی سے ایک مشترکہ بولی بن کر نمایاں ہونے لگی۔

ترکی، فارسی اور عربی الفاظ اس مقامی زبان میں داخل ہو کر اس میں جذب ہو گئے جن کی وجہ سے اس زبان کے اظہار کی قوت بڑھی اور ادبی تخلیق کا عمل تیز تر ہو گیا۔ اس ادب کی ایک مکمل تاریخ ہے جس کے نمونے برصغیر پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں ملتے ہیں اور ہر علاقے کے ادبی نمونے گہری مماثلت کے باوجود، ساخت و مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ زبان ابھی اپنی تشکیل کے دور سے گزر رہی تھی

* لیکچرار شعبہ اردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیرپور سندھ پاکستان

اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ جہاں جہاں یہ زبان پہنچی وہاں وہاں علاقائی اثرات کو جذب کر کے اپنی شکل بناتی رہی اس کا ایک حصہ سندھ و ملتان میں تیار ہوا تو دوسرا سرحد و پنجاب میں۔ جہاں سے تقریباً دو صدی بعد یہ دہلی پہنچی اور وہاں کی زبانوں کو جذب کر کے اور ان میں جذب ہو کر سارے برصغیر میں پھیل گئی۔ گجرات میں یہ زبان گجُری کہلائی دکن میں دکنی، کسی نے اسے ہندوستانی، ہندی یا ہندوی کہا اور کسی نے اسے لاہوری یا دہلوی کے نام سے موسوم کیا تو کسی نے اس کا رشتہ برج بھاشا سے جوڑا، مختلف زبانوں سے اس کا تعلق اور مختلف زبانوں کے علاقوں کا اس زبان پر یہ دعویٰ اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے سب سے فیض اٹھا کر اپنے وجود کو انفرادیت بخشی، آج جسے ہم اردو کے نام سے پکارتے ہیں جدید ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور عربی، ایرانی، ہندی، تینوں تہذیبوں کا سنگم اور اُن کی منفرد علامت ہے اس زبان میں ان تہذیبوں کی ہم گیر صفات یکجا ہوگئی ہیں۔

برصغیر میں اشاعت علم مسلمانوں کے دیگر تہذیبی کارناموں کی طرح ایک نمایاں کارنامہ ہے(۱)۔ ابتدا ہی سے مسلم معاشرے میں تعلیم و تربیت کو ایک خاص اہمیت دی جاتی تھی(۲)۔ عرب مسلمانوں نے آٹھویں صدی کے آغاز پر صوبہ سندھ میں قدم جمائے۔ سندھ میں عربی رسم الخط اس بات کی دلیل ہے کے عربوں کو طرز حکومت میں ہی دلچسپی نہ تھی بلکہ ان کا طریقہ تبلیغ و اشاعت ایسا تھا کہ وہ مفتوحہ باشندوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ عربوں کے بعد محمود غزنوی کے حملوں کا سلسلہ دسویں صدی کے آخر اور گیارہوں صدی کے آغاز پر شروع ہوا۔ محمد غوری نے بارہویں صدی کے آخری زمانے میں دہلی فتح کر کے مسلمانوں کی مستقل سلطنت کی داغ بیل ڈالی جو پانچ سو برس بڑی شان و شوکت کے ساتھ قائم رہی اور پھر تقریباً ڈیڑھ سو برس تک کمزور صورت میں قائم رہی۔ سلاطین دہلی: محمود غزنوی، قطب الدین ایبک، شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود، غیاث الدین بلبن، علاؤ الدین خلجی، محمد تغلق، فیروز تغلق، سکندر لودھی اور ابراہیم لودھی، وغیرہ علوم و فنون سے دلچسپی رکھتے تھے انہوں نے باوجود جنگی مصروفیات کے علوم و فنون کی بڑھ چڑھ کر سرپرستی کی۔

اسی مغل شہنشاہ بابر اور اس کے جانشین ترکستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان سے تھے۔ بابر کی خودنوشت سوانح عمری تزک بابری، اس کے علمی ذوق و شوق اور قابلیت کی دلیل ہے(۳)۔ شاہانہ مغلیہ اور امراء نے بے شمار مدرسے قائم کیے اور ان کے اخراجات کے لیے فراغ دلی سے جاگیریں وقف کر دیں۔ مدرسوں میں قابل معلم تھے اکثر مدرسوں میں ہزاروں طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے۔ طلبا کو وظائف دیئے جاتے تھے۔ ہر بڑے شہر میں مدرسے قائم کیے گئے۔ دہلی اور صوبائی صدر مقامات میں مدرسوں کی تعداد بہت زیادہ تھی طلبا دور دور سے تحصیل علم کے لیے آتے

تھے ان کی رہائش اور خورد ونوش کا معقول انتظام تھا۔ یہ مکتب اور مدرسے ملک کی تعلیمی ضرورت کو بخوبی پورا کرتے تھے۔ معیار تعلیم بلند تھا۔ مدرسوں میں دینی علوم، فقہ، حدیث، تفسیر کے علاوہ دنیوی علوم فلسفہ، منطق، خطابت، ادب، ریاضی، تاریخ، طب، فلکیات وغیرہ پڑھائے جاتے تھے۔ نصاب دین اور دنیوی دونوں قسم کے مضامین پر مشتمل تھا طلبا کو آزادی تھی کہ وہ اپنی دل چسپی کے مطابق مضامین کا انتخاب کریں۔ علمی اور ذہنی تعلیم کے ساتھ ساتھ ملک میں دستکادی کی تربیت کے معقول انتظامات تھے، گو وہ غیر رسمی تھے مگر فرد اور معاشرے کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔

۱۷۰۷ء میں مغل شہنشاہ اورنگزیب عالم گیر کے انتقال کے بعد سلطنت میں شدید انحطاط پیدا ہوگیا اور چاروں طرف خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ جس سے ملک کا معاشرتی اور اقتصادی نظام تہہ و بالا ہوگیا۔ مرکزیت کے ختم ہونے کے ساتھ انگریز وہی ملک کے طولوعرض میں چھوٹے بڑے تہذیبی جزیرے وجود میں آ گئے جن میں فارسی زبان اور ایرانی تہذیب کو ثانوی حیثیت حاصل رہی اور اس کی جگہ اردو زبان اور ہندوستانی تہذیب نے لے لی (۴)۔ فارسی زبان وادب اس کے اسالیب واصناف اسی نئے ادب وزبان میں جذب ہونے لگے۔ شمالی ہند میں اٹھارویں صدی سے پہلے اردو زبان میں لکھنا کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی لیکن اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہی اردو زبان نے نہ صرف فارسی کی جگہ لے لی بلکہ ادبی زبان بن کر برصغیر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل گئی۔ جب انگریزوں کا اقتدار قائم ہوا تو اردو کو ہندو مسلمان ایک ساتھ استعمال کرتے تھے۔ اسی لیے انگریزوں کو معاشرے کی جڑوں تک پہنچنے کے لیے اس زبان کی مدد حاصل کرنی پڑی۔ مندرجہ بالا پس منظر میں یہ بات حیران کن ہے کہ عین اس دورِ انتشار میں جب مغلیہ سلطنت کے در و دیوار گر رہے تھے اور معاشرہ زوال پذیر تھا۔ اردو ادب اور اس کی روایت کیسے وجود میں آ گئی؟ اردو شمالی ہند کے لیے کوئی نئی اور اجنبی زبان نہیں تھی یہ انہی کی زبان تھی۔ خود دکن میں پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل سے اس میں باقاعدہ ادب کی روایت کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور تین سو سال کے عرصے میں وہاں اردو زبان وادب کی کم وبیش وہی اہمیت حاصل ہوگئی تھی جو شمال میں فارسی زبان وادب کی تھی (۵)۔ جب تک مغلیہ سلطنت اپنی مرکزیت کے ساتھ قائم رہی فارسی اس کی دفتری اور سرکاری زبان تھی۔ جیسے ہی اٹھارویں صدی عیسوی میں زوال کا عمل شروع ہوا فارسی کا اثر بھی کم ہونے لگا۔ اور اس کی جگہ ملک گیر زبان کی حیثیت سے اردو سامنے آنے لگی (۶)۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور اورنگ ذیب اردو زبان سے واقف تھے لیکن جہاندار شاہ کی تخت نشینی کے بعد عوام کا اثر ورسوخ قلعہ معلیٰ میں اتنا بڑھا کی لال کنور ملکہ بن گئی انوپ بائی نے عزیز الدین عالم گیر ثانی کو اور ادھم بائی نے محمد شاہ کے محل کی زینت بن کر احمد شاہ بادشاہ کو جنم دیا۔ اسی زمانے میں اردو دربار کی غیر سرکاری

زبان بن کر قلعہ معلیٰ میں باقاعدہ رائج ہوگئی (۷)۔ محمد شاہ نے اردو میں طبع آزمائی کی۔ عالم گیر ثانی اردو کا شاعر تھا ۔اس کے اشعار بیاضوں میں ملتے ہیں۔ شاہ عالم ثانی نہ صرف اردو بلکہ پنجابی، ہندی اور فارسی کا شاعر تھا۔اس نے عجائب القصص کے نام سے ایک طویل داستان بھی لکھی جو اُردو نثر کے ارتقا میں تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔قلعہ معلیٰ میں اُردو معلیٰ کی یہ روایت باقاعدہ طور پر محمد شاہ سے بہادر شاہ ظفر تک جاری رہی۔

انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے برصغیر کی تعلیمی ذمہ داریاں انگریزوں نے اپنے ہاتھ میں لینی شروع کر دیں تھیں۔ وارن ہیسٹنگز ((warren Hestings نے کلکتہ میں ایک مدرسہ ۱۷۸۰ء میں قائم کیا جہاں مسلمان امراء کے بچوں کو عربی اور فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دوسرا مدرسہ ۱۷۹۰ء میں بنارس میں ہندوؤں کے لیے قائم کیا جہاں سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ان مدارس میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے علاوہ فلسفہ، دینیات، قانون، فلکیات، علم ہندسہ، ریاضی، منطق، فن تقریر اور قواعد وغیرہ کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔اس طرح انگریزوں نے ابتدا میں ہندوستان میں ایسے تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھی جو اورینٹل (مشرقی) علوم کی تعلیم دیتے تھے سیاسی مصلحت کی بنا پر کمپنی کو مشن اسکولوں کی اعانت سے ہاتھ اٹھانا پڑا(۸)، اور اُنھوں نے عیسائی مذہب کی تبلیغ کی ممانعت شروع کی کیونکہ کمپنی مذہبی معاملات میں غیر جانبداری کی پالیسی اختیار کرنا چاہتی تھی۔اس طرح ۱۷۶۵ء سے ۱۸۱۳ء تک کمپنی کا رویہ تعلیم کے معاملے میں یہ رہا کہ ہندوستانیوں کو مشرقی علوم کی تعلیم دی جائے۔مشن اسکول ہندوستانی بچوں کو انگریزی تعلیم دیتے اور مذہب کی تبلیغ بھی کرتے تھے لیکن جب کمپنی نے ان اسکولوں کی مالی امداد بند کر دی تو پادریوں نے کمپنی کے رویے کے خلاف برطانوی پارلیمنٹ میں احتجاج کیا۔۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا تا کہ کمپنی کے ملازمین کو ہندوستانی زبانوں کی ٹریننگ دی جائے۔اس کالج میں عربی، فارسی، سنسکرت کے علاوہ اردو کا شعبہ بھی قائم کیا گیا۔کالج نے اردو کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا کالج کے ۲۰ سالہ دور میں اٹھارہ مصنفین نے پچاس سے زائد کتابیں اردو میں تصنیف و تالیف و ترجمہ کیں۔ابتدا میں کمپنی مشرقی علوم اور عربی و فارسی کا تعلیم کی حمایتی تھی لیکن مشن اسکولوں اور چارلس گرانٹ نے انگریزی تعلیم کے ساتھ مغربی علوم بھی پڑھانے کی تجویز دی آخر کار پارلیمنٹ نے ۱۸۱۳ء میں ہندوستان کی تعلیم کے لیے کچھ تجاویز منظور کیں جن میں مشن اسکولوں کو تعلیم اور تبلیغ کی اجازت دے دی گئی اور پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مالکان کو تاکید کی کہ وہ ہندوستان کی تعلیم لیے ایک لاکھ روپیہ سالانہ ملکی آمدنی میں سے خرچ کیا کریں۔۱۸۲۵ء میں دہلی کالج قائم کیا گیا اس کالج میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔کالج میں ۱۸۴۲ء میں اینگلو ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم کی گئی جس کے سربراہ امام بخش صہبائی اور ماسٹر رام چندر تھے۔ جو کالج کے

اساتذہ میں سے تھے۔اس سوسائٹی نے عربی، فارسی، سنسکرت اور انگریزی سے اردو میں تراجم کیے۔سائنسی علوم، کیمیا، طبیعات اور ریاضی کتب کو اُردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا جس سے اُردو کے علمی ذخیرہ میں اہم اضافہ ہوا۔

۱۸۱۳ء سے ۱۸۳۵ء تک کمپنی سیاسی معاملات اور فتوحات میں مشغول رہی اس لیے اس کے عہدارانِ نے تعلیم کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق ہے ان کی اس معاملہ میں کوئی آواز نہیں تھی۔ملک کے تمام باشندے گذشتہ سو سال سے زیادہ کی خانہ جنگیوں اور تباہ کاریوں سے عاجز تھے اور امن کے خواہان تھے۔تعلیمی معاملات میں مختلف حلقوں میں اختلافات تھے مثلاً تعلیم کا مقصد کیا ہونا چاہیے؟ تعلیم کا بندوبست کون کرے؟ تعلیم کون سی زبان میں دی جائے؟ تعلیم کا طریقہ کار کیا ہونا چاہیے؟ گورنر جنرل لارڈ ولیم بیٹنگ نے ۱۸۳۵ء میں ہندوستانیوں کے لیے انگریزی ذریعہ تعلیم قرار دیا اور مندرجہ ذیل تجاویز منظور کی گئیں۔

۱۔ حکومت کا مقصد ہندوستانیوں میں علوم کی اشاعت ہے۔

۲۔ تمام رقم انگریزی تعلیم پر صرف کی جائے۔

۳۔ آئندہ مشرقی علوم کے کسی طالب علم کو نئے وظیفے کی منظوری نہیں دی جائے گی۔

۴۔ مشرقی علوم میں ترجموں پر کچھ خرچ نہیں کیا جائے گا۔

۱۸۳۵ء سے ۱۸۵۲ء تک انگریزی اور مغربی علوم کی تعلیم کے لیے ہندستان میں مشن اسکول قائم ہوئے یہ اسکول تیزی کے ساتھ ہندوستان کے تمام صوبوں میں پھیل گئے متعدد عیسائی مشن سوسائٹیوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں اسکول اور کالج کھول دیئے ان اسکولوں اور کالجوں کا اولین مقصد عیسائی مذہب کی تبلیغ تھا۔چونکہ تعلیم سے بہتر اشاعت کا ذریعہ کوئی نہیں اس لیے مختلف مشن سوسائیٹیوں نے تعلیم کے ذریعے عیسائی مذہب کی اشاعت شروع کی۔دیسی زبان کے مشن اسکول بھی قائم کیے گئے۔تیسرے قسم کے اسکول جو کے ملک میں رائج تھے وہ ہندوستانیوں کے نجی اسکول تھے۔جن میں ابتدائی اور اعلیٰ دونوں قسم کے اسکول شامل تھے۔مگر کمپنی ان اسکولوں کو نہ مالی امداد دیتی تھی اور نہ ان کو تسلیم کرتی تھی۔عام طور پر ہندوستانی اور کمپنی دونوں ایک دوسرے کے اسکولوں کو مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان کو خدشہ یہ تھا کہ ان اسکولوں کے ذریعے ان کو آہستہ آہستہ عیسائی بنایا جارہا ہے۔

اب جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو انہوں نے ۱۸۸۳ء تک جدید تعلیم میں بہت کم حصہ لیا۔اور عام طور پر وہ انگریز حکومت اور انگریزی تعلیم دونوں کے مخالف تھے۔ان کے بچے زیادہ تر دیسی مکتبوں اور مدرسوں میں تعلیم پاتے تھے۔جن کی وجہ سے جدید تعلیم میں مسلمان ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ گئے۔اسی دوران ۱۸۵۷ء کا انقلاب

رونما ہوا اور اس کے بعد ہندوستان باقاعدہ طور پر تاج برطانیہ کے ماتحت ہو گیا۔ انقلاب کی ناکامی نے مسلمانوں کو شدید متاثر کیا۔ تعلیم میں پہلے ہی وہ پیچھے تھے اور سرکاری ملازمتیں بھی ان کے پاس نہ تھیں حکومت نے مسلمانوں کے نجی مدرسوں کے لیے وقف املاک بھی قبضے میں لے لیں جس سے ان کا تعلیمی نظام مزید ابتری کا شکار ہو گیا۔ اسی دوران صوبہ متحدہ (یوپی) میں ہندوؤں نے حکومت کو یہ سفارش کی کہ عدالتوں میں اردو کی جگہ ہندی کو دی جائی جو کے دیوناگری رسم خط میں لکھی جاتی ہے۔ کیونکہ اس صوبے میں ہندو اکثریت میں ہیں۔ اس مسئلے پر مسلمانوں اور ہندوؤں میں اختلاف سامنے آئے اور مسلمانوں نے احتجاج کیا۔ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں نے بھی سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط ختم کروانے کی کوششیں شروع کر دیں (۹)۔ اس واقعہ سے شمال مغربی اضلاع کے ہندوؤں کا بھی حوصلہ بڑھا اور انھوں نے بھی اردو کے خلاف تحریک تیز کر دی ۔۱۸۸۲ء میں جب سرسید احمد خاں وائسرے کی لجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے ایجوکیشن کمیشن میں ہندوؤں کو اردو کی مخالفت کا پھر موقع ہے۔ شمال مغربی اضلاع اور پنجاب کے ہندوؤں نے اردو زبان اور فارسی خط کی مخالفت تیز کر دی۔ بے شمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے میموریل کمیشن میں پیش کیے گئے۔ جس کے جواب میں سرسید احمد خاں اور ان کے بعض مسلمان دوستوں نے بھی پنجاب میں 'انجمن حمایت اُردو' قائم کی اور میموریل کمیشن میں بھیجے جن کی وجہ سے کمیشن نے دونوں پارٹیوں کی درخواستوں پر رائے نہ دی۔ ۱۸۶۷ء میں سرسید احمد خاں نے گورنمنٹ کو یہ درخواست دی کے صوبہ متحدہ میں ایک Vernacular University قائم کی جائے جس میں اردو ذریعے تعلیم ہو۔ اس سلسلے میں سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ تراجم شدہ مواد اور کتابیں فراہم کرے گی لیکن ان کی یہ درخواست منظور نہ ہوسکی۔ اور اس مسئلے نے شدت اختیار کر لی کہ کون سی Venracila زبان استعمال کی جائے (۱۰)۔ ہندوؤں کی اس تمام اردو مخالف مہم کا سرسید اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس بھرپور جواب دیا اور جب مخالفت حد سے بڑھ گئی تو ۱۹۰۳ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے انجمن ترقی اردو کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کے مقاصد میں اردو کے دفاع کے ساتھ اردو کے علمی و ادبی سرمائے کو بڑھانا بھی شامل تھا۔ اس تمام مخالفت کے باوجود مسلمانوں نے اردو زبان کو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال کرتے ہوئے مختلف تعلیمی ادارے قائم کیے۔ ان اداروں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور ان کے جداگانہ تشخص کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

دارالعلوم دیوبند:

۱۸۶۷ء میں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دیوبند کی مسجد چھتہ میں مدرسہ قاسم العلوم کی بنیاد رکھی جو بعد میں

دارالعلوم دیوبند کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ دارالعلوم عام مدرسہ نہیں تھا بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی روحانی اور سیاسی تربیت کا ایک خصوصی ادارہ تھا۔عربی، فارسی کی تدریس کے علاوہ اردو زبان کو بھی زریعہ تدریسی کہ طور پر اپنایا گیا۔ دارالعلوم نے مسلمانوں کے ذہنی جمود اور سکوت کو توڑا، ان میں کچھ کرنے اور آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کیا۔علی گڑھ تحریک کی پیدا کردہ سیاسی بیداری کو فروغ دیا۔اس دارالعلوم نے شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا عبیداللہ سندھی، مفتی کفایت اللہ جیسے مفکر اور عالم دین پیدا کیے اور مولانا بشیر احمد عثمانی جیسے علماء نے تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔ دارالعلوم سے وابستہ علماً نے متعدد علمی تاریخی اور مذہبی کتابیں تحریر کیں، قرآن پاک کی تفسیریں لکھیں اور دینی مسائل کو حل کرنے کے لیے کتب لکھیں جو کے اردو زبان میں اہم اضافہ ہیں۔اس مدرسے نے نہ صرف تہذیبی افکار کو فروغ دیا بلکہ مسلمانوں کو اخلاقی اور سیاسی شعور بھی بخشا۔ اسلام اور مسلمانوں پر لگائے جانے والے الزامات کے سائنٹفک دلائل کے ساتھ جوابات دیئے۔

سندھ مدرستہ الاسلام:

۱۸۸۲ء میں حسن علی آفندی نے شمالی ہند کا دورہ کیا۔ وہ اس دورے میں سرسید احمد خاں سے بھی ملے اور علی گڑھ کالج کا بھی دورہ کیا جس نے انھیں بہت متاثر کیا اور واپسی پر انھوں نے اپنے رفقا سے صلاح ومشورے کے بعد ۱۶ مارچ ۱۸۸۴ء کو محمڈن ایسوسی ایشن سندھ قائم کی۔ ابتدا میں اس کے ممبرن کی تعداد ۶۳ تھی۔اس ایسوسی ایشن کا اہم مقصد سندھ کے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنا تھا کہ وہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کر سکیں جس وقت یہ ایسوسی ایشن قائم کی گئی اس وقت سندھ میں کوئی بھی سیاسی پارٹی موجود نہیں تھی۔ سرسید کی طرح حسن علی آفندی کے رفقا نے اس تحریک میں اُن کا بھرپور ساتھ دیا۔سندھ کے مسلمانوں کی تعلیمی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ۳۱ اگست ۱۸۸۵ء میں اس ایسوسی ایشن نے سندھ مدرستہ الاسلام کی بنیاد رکھی جس کا اہم مقصد سندھ کے مسلمانوں کو جدید تعلیم دینا تھا۔ مدرسہ کے ساتھ ہاسٹل کا بھی انتظام کیا گیا۔اس مدرسے نے سندھ میں جدید تعلیم کو روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔اس ادارے کے نصاب میں اردو زبان کو لازمی مضمون کے طور پر پر شامل کیا گیا۔ سندھ مدرستہ الاسلام کی ترقی اور نتائج سے متاثر ہوکر سندھ کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں نے اس تعلیمی تحریک کو آگے بڑھایا اور ہائی اسکول کی طرز پر مختلف مقامات پر اپنے ذاتی اسکول قائم کیے(۱۱)۔ سندھ میں ان اسکولوں اور کالجوں کے قیام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کے امراء اور علماء سرسید احمد خاں کی فکر سے اتفاق رکھتے تھے اور مغربی علوم کی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے۔ تاکہ مادی تقاصوں کو پورا کیا جا سکے۔ برصغیر پاک و ہند کے بالغ نظر

بزرگ ہمیشہ عربی وفارسی اوراردو کی حمایت کرتے آئے ہیں اسی لیے وہ انگریزی کی تعلیم کے ساتھ ان زبانوں کی تعلیم کے لیے بھی کوشاں رہے۔اردو زبان سے والہانہ تعلقات ملک بھر کے مسلمانوں میں نہ صرف جاری تھا بلکہ وہ اس کی ترقی اور فروغ کے واسطے ہمیشہ کام کرتے رہے۔متحدہ بنگال،سندھ پنجاب، یوپی، بہار، جنوبی ہند غرض ہر جگہ یہ کیفیت تھی۔۱۹۰۱۔۱۹۰۲ء کے دوران سندھ مدرستہ الاسلام کے پرنسپل مسٹر پرسی ہائڈ کا نظریہ تھا کے اندورِن سندھ کے مسلمان کا پیشہ ان سندھی مسلمانوں کی تعلیم پر کیوں خرچ کیا جائے جو کراچی میں رہتے تھے اور جو بیحد غریب، مفلوک الحال اور سنی مسلمان تھے۔سندھ محمڈن ایسوسی ایشن،آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس،انجمن اسلامیہ لاہور، اسلامیہ کالج پشاور کے بزرگوں میں سوفی صد قومی انداز فکر موجود تھا وہ مسلمانوں کے مجموئی طور پر حقیقی اور صوبائی تشخص کے خلاف تھے اور سندھ کے ساتھ اتحاد کے حامی تھے۔مسٹر پرسی ہائڈ اور علاقائی محکمہ تعلیم نے سنی شیعہ اور کراچی، بیرون کراچی کہ سولات کو آمدنی خرچ کے خوب صورت پردوں میں اجاگر کرکے لڑوا اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل کرنے کی کوشش کی۔پرنسپل نے رپورٹ میں لکھا کہ مدرستہ العلوم کی اردو اور گجراتی برانچیں بند کی جائیں کیونکہ میونسپل بورڈ کراچی کم امداد دیتا ہے۔پرنسپل کا کہنا تھا کہ سندھیوں کا پیسہ اردو، گجراتی کی تعلیم پر کیوں خرچ کریں ۔اسی حالت میں مدرسہ بورڈ کے اکابر سندھ نے شدید سرکاری دباؤ اور مدرسہ کے انگریز پرنسپل وحکومت کی آراء کو قبول نہیں کیا اور دونوں زبانوں کی تعلیم جاری رکھی۔

ندوۃ العلماء کی تعلیمی تحریک:

مولانا شبلی نعمانی جو کہ سرسید احمد خاں کے رفیق کار تھے اور جنہوں نے علی گڑھ کی تعلیمی تحریک میں تعاون کیا تھا انھوں نے کچھ نظریاتی اختلافات کی بنا پر علی گڑھ سے علیحدگی اختیار کرلی اور ایک ایسی تحریک کا آغاز کیا جس کا مقصد اسلامی قدروں اور اردو زبان وادب کا فروغ تھا۔ ۱۸۹۲ء میں مدرسہ فیض عام کان پور کے ایک سالانہ اجلاس میں مولانا سید محمد علی مونگیر نے ندوۃ العلما کی تعلیمی تحریک کا خیال پیش کیا۔اس اجلاس میں ہندستان کے اکثر علما اکرام تشریف لائے تھے۔انہوں نے اس نظریے کی حمایت اور تائید کی۔ان علماء میں مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مولانا حافظ شاہ محمد حسین الہٰ آبادی اور مولانا اشرف علی تھانوی شامل تھے۔ندوۃ العلماء کے نائب منتظم مولانا سید عبدالحی ، اور سید محمد علی نے دسمبر ۱۸۹۵ء میں ہندوستان کے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور وہاں ندوۃ العلما کی تعلیمی تحریک سے لوگوں کو متعارف کرایا۔

۲ دسمبر ۱۸۹۸ء میں ندوہ کا تعلیمی دفتر کانپور سے لکھنؤ منتقل ہوا اور اسی مہینے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا آغاز ہوا

اور ابتدائی درجات میں تعلیم و تدریس کا آغاز کر دیا گیا۔ دارلعلوم ندوۃ العلماء کے روح رواں مولانا شبلی تھے انھوں نے نہ صرف تعلیم و تدریس میں نام پیدا کیا بلکہ اپنی انشا پردازی سے لوگوں کو ندوۃ العلماء کا گرویدہ بنا دیا۔ ندوۃ کے نامور طلبا میں مولانا سلیمان ندوی، مولانا سید عبدالسلام ندوی، مولوی ضیاء الحسن ندوی اور مولانا اکرم اللہ خاں ندوی جیسے عالم و فاضل شامل ہیں۔ ندوۃ العلما کے نصاب تعلیم میں دینی علوم، قرآن پاک کی تعلیم اس کی تفسیر، احادیث نبوی کا مطالعہ، فقہ، تاریخ اسلام، شریعت کے امور اور جدید علوم شامل تھے۔ اردو کے ساتھ انگریزی اور ہندی کی تعلیم تدریس بھی نصاب کا حصہ تھی (۱۲)۔ ندوۃ العلماء کے مقاصد کے لحاظ سے اسے ایک تحریک کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ علی گڑھ تحریک کی طرح اس میں بھی چند علماء کی مشترکہ جدوجہد شامل تھی۔ ندوہ کی سب سے بڑی خدمت یہ تھی کے اس نے قدامت پسند علماء کو نئے زمانے کے تقاضوں سے متعارف کرایا اور مذہبی تعلیم کو دوسرے علوم سے بھی ہم آہنگ کیا۔ ندوہ سے ایک رسالہ الندوہ جاری ہوتا تھا۔ اس رسالے نے اردو زبان و ادب کے فروغ و ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

ندوہ دو علمی سرچشموں سے فیض یاب ہوا، ایک علی گڑھ اور دوسرا مصر۔ ان دونوں سرچشموں تک اس کی رسائی شبلی کے ذریعے ہوئی شبلی نے علی گڑھ میں سولہ سال ۱۸۹۸-۱۸۸۳ء کے دوران جدید علوم اور طریقہ تحقیق سے جو واقفیت حاصل کی وہ سب ان کے ذریعے ندوہ پہنچی۔ سر سید احمد خاں نے مغربی نکتہ چینیوں کے اعتراضات کا جواب دینے کا جو طریقہ خطبات احمدیہ میں اختیار کیا تھا اسے شبلی نے ندوہ کو منتقل کیا۔ ندوہ پر دوسرا اثر مصر کا پڑا جو اسلامی دنیا کا ذہنی مرکز تھا۔ مولانا شبلی کو علی گڑھ میں ملازمت کے دوران مصر جانے اور وہاں کے اہل علم سے روابط قائم کرنے کا موقع ملا ان ہی کے ذریعے برصغیر کے اسلامی مدارس بالخصوص ندوۃ العلماء کی مصر میں چھپنے والے رسائل اور کتب تک رسائی ہوئی اور ان میں سے اکثر ندوہ کے نصاب میں شامل ہوئیں۔ ندوہ نے ان دونوں (علی گڑھ اور مصر) سرچشموں سے فیض حاصل کر کے ایسے علماء پیدا کیے جن کی نظر رفتار زمانہ پر رہی اور جو ایک خاص اسلوب کے تحت قوم کے علمی روایات کو پورا کرنا چاہتے تھے۔ ان درسگاہوں کے ذریعے برصغیر میں اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت کی ایک عام فضا پیدا ہوگئی۔ اسلامی و عربی مدارس کا ایک جال سارے برصغیر میں پھیل گیا اور تمام چھوٹے بڑے شہروں اور قصبات کے مسلمان ان اداروں سے فیض پانے لگے۔ ان مدارس نے جہاں ایک طرف مسلمانوں کی مذہبی و تہذیبی زبانوں عربی و فارسی اور اردو کی حفاظت اور علوم اسلامیہ کی اشاعت کی تو دوسری طرف علماء کو ایسے ادارے بھی فراہم کیے جن سے منسلک رہ کر وہ اپنی جدوجہد کو قوم کے لیے مخصوص کر سکتے تھے۔ اس طرح ان مدارس نے

علماء کا رابطہ ان کے شاگردوں سے بڑھا کر عام مسلمانوں کے ساتھ استوار کیا۔ بیسویں صدی کے اوائل تک علوم اسلامیہ کے ادارے مسلمانوں میں بہت مقبول ہوئے (۱۳)۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

اس ادارے میں مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ اس تحریک کی ابتدا آپ ہی کی کاوشوں سے علی گڑھ میں ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ہوئی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں چند انتظامی امور کی بنا پر اس تحریک کو دہلی منتقل کرنا پڑا۔ اس ادارے نے حکومت کی منظوری اور امداد لینے سے انکار کر دیا تھا۔ جامعہ ملیہ کو نظام حیدرآباد اور ریاست بھوپال امداد دیتی تھی۔ حکیم اجمل خاں پہلے امیر جامعہ اور مولانا محمد علی پہلے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے بعد میں ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ مقرر ہوئے جن کی علمی اور انتظامی قابلیت نے اسے ایک عظیم قومی درس گاہ بنا دیا اور اس جامعہ نے تعلیم کے ہر شعبے کو اپنے قومی تشخص سے نوازا اور ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا انتظام کیا۔ اساتذہ کی تربیت کا ادارہ بھی قائم کیا گیا۔ تصنیف و تالیف کا شعبہ بھی قائم کیا کی اور نشر و اشاعت کے لیے پریس قائم کیا۔ غرضیکہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے تعلیم کی اشاعت و فروغ میں نمایاں ترقی کی اس تعلیمی ادارے نے نہ صرف طلبہ کو قومی تعلیم سے ہمکنار کیا بلکہ اس کی اردو اکیڈمی کی طرف سے متعدد مفید علمی، تعلیمی، تاریخی اور سیاسی کتابیں بھی شائع کی گیئں (۱۴) ۔

جامعہ عثمانیہ:

۱۹۱۷ء میں اس عظیم الشان درس گاہ کی داغ بیل ڈالی گئی۔ حیدرآباد دکن میں اردو یونی ورسٹی کا قیام مسلمانوں کی اولین ضرورت تھی۔ انجمن ترقی اردو کے سیکرٹیری مولوی عبدالحق بھی اس یونی ورسٹی کے قیام کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ عثمانیہ یونی ورسٹی کے قیام کا بڑا مقصد اردو کی ترویج اور طلبا کو دوسری زبانوں کی مدد سے تعلیم حاصل کرنے کے نقصانات سے محفوظ رکھنا اور تعلیم کی روح تک ان کی رسائی کو آسان بنانا تھا۔ ابتدا میں کنگ کوٹھی کے قریب کرایہ پر حاصل کی گئی عمارتوں میں اس جامعہ نے کام کا آغاز کیا۔ جامعہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے شہر سے چار میل کے فاصلے پر بارونق، پُر بہار مقام اڈیکمیٹ (اڈیکمیٹ تلنگی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی بلند ترین چوٹی کے ہیں) پر اس عظیم شہرِ علم کو بسایا گیا۔

۱۹۳۴ء میں جامعہ اپنی نئی عمارت میں منتقل ہوگئی اردو زبان کی اس پہلی اردو یونی ورسٹی کو اردو کی صاحب

دیوان شاعرہ ''ماہ لقا چاندہ بائی'' کی جا گیر اڈیکمیٹ پر بسایا گیا۔ برصغیر میں یہی درس گاہ ہے جہاں ہر علم وفن جو عربی، فارسی یا انگریزی کی اجنبیت لے کر دکن آیا اور اردو کے قالب میں ڈھل کر جامعہ عثمانیہ کی فضاؤں میں یوں رچ بس گیا جیسے وہ دکن میں پیدا ہوا ہو۔ سائنس، طب، انجینئر نگ، قانون، طبیعات، کیمیا، حیاتیات، معاشیات، ارضیات، تاریخ جغرافیہ غرض کہ کوئی علم ایسا نہ تھا جو اردو میں نہ سکھایا جاتا ہو۔ اردو ذریعے تعلیم ہونے کا یہ مقصد نہیں تھا کہ وہاں کے طلبہ انگریزی سے نابلد تھے جامعہ کے بے شمار طلبا نے یورپ سے اعزازات اور ڈگریاں حاصل کیں۔ جامعہ عثمانیہ کی عظیم الشان تجویز کو علمی جامہ پہنانے اور اس کو بہ ہمہ وجود کامیاب بنانے کے لیے جو چیز سب سے زیادہ مقدم اور ضروری تھی اور جس پر اس یونی ورسٹی اور اس کی تعلیم کا دارومدار تھا وہ دارالترجمہ یا شعبہ تالیف وتراجم کا قیام تھا۔ کیوں کے تمام علوم فنون کی معیاری کتابوں کو اردو میں لانا ضروری تھا۔ دارالترجمہ عثمانیہ کے قیام سے دکن کی اپنی ادبی روایات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا اردو میں بڑے پیمانے پر جدید علوم اور سائنسی کتب کے ترجمے کے لیے سائنٹیفک اصولوں کی بنیاد پر یہاں دارالترجمہ میں تراجم کیے گئے۔ دارالترجمہ کے پہلے ناظم انجمن ترقی اردو کے سیکریٹری مولوی عبدالحق مقرر ہوئے۔ اس شعبے کا مقصد یہ تھا کہ جامعہ عثمانیہ کے لیے ضرور کتب لکھوائی اور ترجمہ کروائی جائیں تا کہ درسی کتب کے طور پر استعمال کی جائیں۔ جامعہ عثمانیہ کا دارالترجمہ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک قائم رہا اور اس ادارے نے تقریباً پانچ سو کتابیں ترجمہ وتالیف کیں۔ ڈاکٹر مجیب الاسلام لکھتے ہیں کہ: ''دارلترجمہ عثمانیہ میں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک چار سو ستاون (۴۵۷) کتابیں ترجمہ وتالیف ہوئیں۔ ان میں سے چار سو چھبیس (۴۲۶) کتابیں ترجمہ اور اکتیس ۳۱ کتابیں تالیف کی گئیں۔ تمام تراجم میں ۳۶۰ کتب انگریزی سے ترجمہ کی گئیں۔ پانچ جرمن تصانیف کے ترجمے کئے گئے۔ تین فرانسیسی زبان سے ترجمے کیے گئے۔۔۔ اکیاون عربی زبان سے ترجمے کیے گئے۔ سترہ فارسی تصانیف ترجمہ ہوئیں'' (۱۵)۔ یہ کتابیں جامعہ کی لیے دارالطبع سے شائع ہوئیں۔ قلیل مدت میں مختلف علوم وفنون کی کتب کو ترجمہ کروا کر شائع کرنے سے اردو ایک کامیاب علمی زبان بن گئی اور اردو میں وہ صلاحیت پیدا ہوئی کہ وہ علمی صورت اختیار کر گئی، جو دنیا کی دوسری بڑی زبانوں میں دیکھی جاتی ہے۔ اس ادارے کے تراجم افادیت سے پُر تھے انہی کی بدولت عثمانیہ یونی ورسٹی میں اردو ذریعہ تعلیم کا جو تجربہ کیا گیا وہ نہایت کامیاب رہا۔ ۔ جامعہ عثمانیہ میں اصطلاح سازی کے کام میں بھی غیر معمولی اور مفید پیش رفت ہوئی، جامعہ کی پہلی وضع اصطلاحات کمیٹی میں وحیدالدین سلیم کا نام سرفہرست ہے۔ ماہرین زبان کی حیثیت سے جن افراد کا شامل کیا گیا ان میں مولوی عبدالحق، نظم طباطبائی، عبداللہ عمادی اور مرزا محمد ہادی رسوا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کمیٹی نے پہلے

متفقہ طور پر انگریزی اصطلاحات کو اردو اصطلاحوں میں وضع کرنے کا فیصلہ کیا۔ قانون، انجینئرنگ، ریاضی، طب یونانی، میڈیسن، کیمسٹری۔ فزکس، اخلاقیات، نفسیات، فلسفہ، سیاسیات، معاشیات، تاریخ، نباتات سوشیالاجی، زولوجی، جغرافیہ کی تقریباً ۵۵ ہزار اصطلاحات وضع کی گئیں۔ تمام مضامین کے اردو ترجمہ کرنے سے اصطلاحوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا اس ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں کہ: ''قدیم وجدید اردو اصطلاحات کی تعداد کم وبیش تین لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے اتنا بڑا ذخیرہ سارے برصغیر میں کی کسی ایک بھی زبان کے پاس موجود نہیں ہے'(۱۶)۔ ان تمام کوششوں کا مقصد اردو زبان کو اس قابل بنانا تھا کہ اسے کسی بھی زبان کے سامنے مقابلے کے لیے کھڑا کیا جا سکے۔

دارالمصنفین:

مارچ ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شبلی نعمانی نے ایک قومی کتب خانے کی تجویز پیش کرتے ہوئے ایک تصنیفی ادارے کے قیام کا ذکر کیا۔ ندووۃ العلماء سے علیحدگی کے بعد شبلی سیرت النبی ﷺ کی تالیف میں مصروف ہو گئے فروری ۱۹۱۴ کو انھوں نے مجلّہ الہلال میں دارالمصنفین کا مجوزہ خاکہ شائع کیا۔ اگست ۱۹۱۴ء میں انھوں نے اعظم گڑھ کو دارالمصنفین کے قیام کے لیے منتخب کیا اور اپنا موروثی امکان اور باغ اس کے لیے وقف کر دیا۔ لیکن وہ اپنی زندگی میں اس کی بنیاد نہ رکھ سکے تاہم ان کی وفات کے تین روز بعد ۲۱ نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کے احباب اور تلامذہ نے دارالمصنفین کے قیام کا فیصلہ کیا۔ سید سلیمان ندوی پونا کالج کی ملازمت چھوڑ کر اعظم گڑھ آ گئے اور مسعود علی ندوی کے انتظامی تعاون اور عبدالسلام ندوی کے علمی اشتراک سے ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین نے کام کا آغاز کیا۔ اس ادارے نے بہت جلد تالیف وتصنیف کا ایک معیار قائم کر دیا جس سے اردو کے تمام سنجیدہ اہل قلم متاثر ہو کر اس کی تقلید کرنے لگے(۱۷)۔ اس ادارے نے بڑا وقیع، علمی، تحقیقی، تاریخی، اور دینی ادب پیش کیا اور مختلف علوم وفنون کی ایک سو سے زائد کتب لکھوا کر شائع کیں۔ برصغیر میں دارالمصنفین اس لحاظ سے ایک منفرد ادارہ ہے کہ اس کے اپنے کل وقتی مصنفین، اپنا مطبع، کتب خانہ اور اپنا دارالشاعت تھا(۱۸)۔

دیگر ادارے:

اس قسم کے تعلیمی اداروں نے مسلمانوں کو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اس طرح کے متعدد تعلیمی اداروں کے قیام کی طرف راغب کیا۔ جن سے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بسنے والے

مسلمان تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔فرنگی محل نے علوم اسلامی کے فروغ اور اس کی روایات کو آگے بڑھانے میں قابل قدر حصہ لیا اور اس کے منسلک علماء نے برصغیر کی قومی اور سیاسی تحریکوں کے دوران مسلمانوں کی رہبری اور قیادت کی۔اس ادارے کا نصاب 'درس نظامی' کہلاتا ہے اور فقہ وغیرہ پر اس لیے توجہ دی کہ اس کے طلبا اسلامی شرعی نظام کے تحت قاضی، مفتی اور محتسب بن سکیں۔

فرنگی محل اور اس سے وابستہ علماء برطانوی عہد کے ہندوستان میں اسلامی تعلیم کی تشکیل نو کی کوشش کی۔'انجمن حمایت اسلام' نے شمال مغربی علاقوں کے مسلمانوں میں پرخلوص تعلیمی خدمات انجام دیں اور لاہور اور پشاور میں اسلامیہ کالجوں کے علاوہ دیگر کئی مقامات پر متعدد اسلامیہ اسکول قائم کئے اس انجمن کا قیام اور اس کی تعلیمی جدوجہد واضح طور پر علی گڑھ تحریک کے زیر اثر تھی۔

بدرالدین طیب جی (۱۸۴۴ء۱۹۰۶ء) کے قریبی ساتھی محمد علی اوگھے سرسید احمد خاں سے ملاقات کی اور ان کی تحریک کا قریب سے مطالعہ کیا اور پھر واپس بمبئی جا کر بدرالدین طیب جی کے ساتھ ملے۔انجمن اسلام بمبئی ۱۸۷۶ء قائم کی۔اس انجمن کے بمبئی کے مسلمانوں میں اشاعت تعلیم کی مفید اور موثر کوششیں کیں۔مسلمانوں کے لیے تعلیمی رعایتوں، سرکاری امداد، مسلمانوں کے لیے اردو اور اینگلو اردو اسکولوں کے قیام کا مطالبہ کیا۔اس انجمن نے خود چندہ جمع کر کے ایک اسکول قائم کیا جس میں قرآن، اردو اور مروجہ نصاب کی تعلیم دی جانے لگی اس اسکول نے بہت جلد ترقی کی اور اس قسم کے اینگلو اردو اسکول اور کالج برصغیر کے مختلف علاقوں میں قائم ہوئے۔

سرسید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کے برصغیر کے دیگر علاقوں کے مسلمانوں کی طرح جنوبی ہند کے مسلمانوں میں بھی اشاعت تعلیم کی تحریک پیدا کی اور مدارس میں 'انجمن مفید اہل اسلام' اور انجمن اسلامیہ قائم ہوئیں۔ان انجمنوں کی تعلیمی سرگرمیوں کے نتیجے میں مدارس کے مسلمانوں تعلیم سرعت سے پھیلنے لگی اور ان کی شرح تعلیم میں اضافہ ہوا۔مدارس میں محمڈن ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف ساؤتھ انڈیا کا قیام مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے طرز پر عمل میں آیا تھا، جس نے جنوبی ہند کے مسلمانوں میں اپنی سرگرمیوں اور اپنی کوششوں سے متعدد اسکول اور کالج قائم کر کے تعلیم کو عام کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔یہ کوششیں اس حد تک مفید ثابت ہوئیں کہ جنوبی ہند کے مسلمان برصغیر کے دیگر علاقوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں آگے بڑھ گئے۔

اگر تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ قوموں کے عروج وزوال میں تعلیم کا کردار ہمیشہ سے بنیادی رہا ہے۔یہ بات طے شدہ ہے کہ علم وفن کی بدولت ہی قوموں اور ملکوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔تعلیم

معاشرے اور قوم کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے، جہاں تک اعلیٰ تعلیم میں اردو کی حیثیت کا تعلق ہے تو اردو اعلیٰ تعلیم کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا کثیر تجربہ رکھتی ہے۔ چنانچہ دہلی کالج اور عثمانیہ یونی ورسٹی میں اعلیٰ تعلیم اردو میں دی گئی یہاں مختلف علوم وفنون پر کتابیں اردو میں ترجمہ و تالیف کی گئیں۔ اردو سائنسی علوم کے لیے نہایت موزوں ہے یہ بات دہلی کالج کے تجربے سے ثابت ہو چکی ہے۔ جس میں تمام جدید علم یعنی جغرافیہ، ریاضی اور کیمیا کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی۔ اس کالج کی مجلس ترجمہ نے تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں ترجمہ کیں۔ اسی طرح عثمانیہ یونی ورسٹی میں بھی اعلیٰ تعلیم اردو میں دی گئی۔ یہ ''نظام'' حکومت کا کارنامہ تھا کہ وہاں اردو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنی۔ جامعہ عثمانیہ اور اس کے دارالترجمہ میں اردو اصطلاحات تیار ہوئیں جو یونی ورسٹی اور کالج سطح پر تدریسی ضروریات کو پورا کرتی رہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں انجینئرنگ کی تعلیم اردو میں دی جاتی تھی اور ڈاکٹری (طب، یعنی ایم بی بی ایس) بھی اردو کے ذریعہ پڑھائی جاتی تھی۔ یہاں سے تعلیم یافتہ ڈاکٹروں کو انگلستان کے ایف آر سی ایس میں آسانی سے داخلہ مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ رڑکی اور آگرے کے انجینئرنگ کالجوں میں بھی اردو ذریعہ تعلیم تھی۔

فورٹ ولیم کالج کے بعد اینگلو عربک ورناکیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی، انجمن پنجاب، سائنٹفک سوسائٹی، دارالتصنیف و ترجمہ حیدرآباد، دارالمصنفین، ندوۃ العلماء، انجمن ترقی اردو، اورینٹل کالج لاہور، ہندوستان اکیڈمی الٰہ آباد، جامعہ ملیہ دہلی اور عثمانیہ یونی ورسٹی، ان اداروں نے اردو کو اعلیٰ تعلیم کے لیے باثروت علمی و تعلیمی زبان بنانے میں جو کردار ادا کیا دراصل وہی کردار اردو کے شاندار مستقبل کی ضمانت بن گیا۔

حوالہ جات

۱۔ معین الدین عقیل ڈاکٹر، تحریک پاکستان کا تعلیمی پس منظر، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان لاہور ۱۹۹۲ ص ۱۱۔

۲۔ اختر الواسع، سرسید کی تعلیمی تحریک، مکتبہ جامع نئی دہلی ۱۹۸۵ء ص ۱۷۔

۳۔ خالد یار خاں، تاریخ تعلیم، اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۸۰ء، ص ۲۲۱۔

۴۔ جعفر ایس ایم، تعلیم ہندوستان کے مسلم عہد حکوت میں، ترجمہ سید انصاری دہلی ۱۹۸۰ء ص ۲۱۵۔

۵۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، مترجم مرزا محمد عسکری سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۴ ص ۲۸۔

۶۔ جمیل جالبی ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد دوم) مجلس ترقی ادب لاہور ص ۱۸۔

۷۔ صباح الدین عبدالرحمٰن (مرتبہ) بزم تیموریہ، اعظم گڑھ ۱۹۴۸ء ص ۳۰۶۔

۸۔ رضوانہ سید علی، اُردو پاکستان کے لیے ناگزیر کیوں؟ مشمولہ اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، فروری ۲۰۰۴ء ص ۱۴۔

۹۔ الطاف حسین حالی، حیات جاوید (جلد اول) دوست ایسوسی ایشن اردو بازار لاہور ۲۰۰۳، ص ۱۶۱۔

۱۰۔ ایضاً ص ۸۴

۱۱۔ یوسف خشک ڈاکٹر، سرسید کی تحریک کے سندھ اور سندھی ادب پر اثرات، تحقیقی جرنل فیکلٹی آف لینگویجز اینڈ اسلامک اسٹڈیز، بہاُالدین زکریا یونیورسٹی ملتان ۲۰۰۳ء ص ۱۱۔

۱۲۔ معین الدین عقیل ڈاکٹر، تحریک پاکستان کا تعلیمی پس منظر، ادارہ تعلیمی تحقیق تنظیم اساتذہ پاکستان لاہور ۱۹۹۲ ص ۸۷۔

۱۳۔ ایضاً ص ۸۸۔

۱۴۔ سید ساجد حسین پروفیسر: تعلیم اور اس کا ارتقار ہبر پبلشرز اردو بازار کراچی، س ن، ص ۳۲۳۔

۱۵۔ مجیب الاسلام ڈاکٹر دارالترجمہ عثمانیہ کی علمی و ادبی خدمات، اردو اکادمی دہلی ۱۹۸۷ء ص ۲۴۲۔

۱۶۔ جمیل جالبی ڈاکٹر: فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ۔ پیش لفظ ص ۷۔

۱۷۔ سلیمان ندوی سید۔ حیات شبلی۔ اعظم گڑھ ۱۹۳۹ء ص ۲۹۹۔

۱۸۔ سید صباح الدین۔ دارالمصنفین اور اس کی خدمات۔ در مقالات یوم شبلی۔ مطبوعہ اردو مرکز لاہور ۱۹۶۱ء، ص ۱۸۳۔

۱۹۔ معین الدین عقیل ڈاکٹر، تحریک پاکستان کا تعلیمی پس منظر، ادارہ تعلیمی تحقیق و تنظیم اساتذہ پاکستان، لاہور ۱۹۹۲، ص ۸۲